تعارفی تحریر "بے ثمر پیڑوں کی خواہش"

چند باتیں

وقتِ موجود میں جدید اور قدیم کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ معنی اگر ہوتے ہیں تو تجزیہ نگاروں کے لئے کیونکہ انہیں اپنے موضوع کو زمانی حدود میں رکھ کر کچھ باتوں کے تعین میں سہولت میسر آجاتی ہے۔ تخلیق کار جس عہد میں اپنا بساط بھر سرمایہ جمع کرتا ہے، اسی عہد کو جانتا اور محسوس کرسکتا ہے۔ محسوس کرنے کے عمل کی پرتوں کا' اس کی پیچیدگیوں کا شمار مشکل ہے۔ احساس اور فکر کے دائرے میں' حالات کی کتنی صورتیں' کن سمتوں سے داخل ہوتی رہتی ہیں' ان کی کتنی صورتیں' کن سمتوں سے داخل ہوتی رہتی ہیں' ان کو حساب میں نہیں لایا جاسکتا۔ تخلیقی سطح پر انہیں کس طرح اور کس حد تک اظہار کی شکل دی جاسکتی ہے اسکا انحصار تخلیق کار پر ہے۔

لکھنے والا اپنی لفظیات ماحول سے کشید کرنے کے بعد اپنے بطن سے از سرِ نو برآمد کرتا ہے پھر انہیں استعمال میں لاتا ہے۔ مطالعہ اور تربیت دونوں کو ماحول کے خانے میں رکھا جاسکتا ہے۔ مطالعے اور تربیت دونوں کو ماحول کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔ مطالعے اور تربیت کے مراحل ہی میں اسکا تعلق اپنے ماضی کے تسلسل سے' یعنی روایت سے قائم ہوتا ہے۔ اسی درسگاہ سے وہ بہت سی بنیادی باتیں جان لیتا ہے۔ کسی کی تربیت تخلیق کے مرحلے سے پہلے شروع ہو جاتی ہے' اور کسی کی' تخلیق کے آغاز کے بعد۔ بعض ایسے بھی ہیں جو تخلیق کے رستوں میں سرگرداں پھرتے ہیں لیکن تربیت کے مراحل سے کبھی نہیں گزرتے اور یقیناً تشویش کی بات ہے۔

مطالعہ تربیت کی بنیاد ہے۔ شعر کی روح کو جاننا' اس کے سرچشموں میں اپنی شناخت تلاش کرنا لازم ہے لیکن وقتِ موجود سے کٹ کر نہیں۔ وقتِ موجود کے ساتھ جڑے رہنا' اس میں اپنی سانس کی حرکت کو محسوس کرنا زندہ لفظ لکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ سو یہ ایک مشکل کام ہوا۔ نہ تو ماضی سے الگ ہو کر اور نہ حال کے ادراک کے بغیر تخلیق کا دائرہ مکمل ہوتا ہے۔ بات چاہے باطنی ہو یا اس کے برعکس اسے اپنے زمانے سے علاقہ تو ہونا ہی چاہیے۔ اس کی پھر ایک تیسری جہت بھی

ہے۔ جو فنکار مستقبل گر بصیرت رکھتا ہے یا visionary ہے وہ آتے زمانے کو بھی محسوس کرے گا اپنے وجدان میں اس کے غیبی وجود کی کوئی شکل بناتا سنوارتا یا توڑتا رہے گا اور اسکا اظہار بھی کرے گا' اور یہی بہترین صورت ہے۔

لیکن اچھا شعر یا صرف شعر ہی کہنے کے لئے اتنا کافی ہے؟ نہیں۔ شاعری بہت آگے کی منزل ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہزاروں لکھنے والوں میں سے چند معدودے چند ہی یاد رکھے جاتے ہیں اور ان معدودے چند میں سے بھی کتنے ہیں جو آئندہ زمانوں کے لئے اپنی تخلیق کا جواز فراہم کر سکتے ہیں۔ ہر عہد کے فکری اور حسی تصورات کا اپنا دائرہ ہے جس میں گئے زمانوں کی تخلیقات شاید فنی سطح پر تو معنویت قائم رکھ سکتی ہیں لیکن ان کے ہونے کا فکری جواز (intellectual relevance) باقی نہیں رہتا۔ وہ تحریریں اپنے ہی زمانے کے فکری تناظر میں دیکھی اور سمجھی جاتی ہیں۔ جو تحریریں جواز فراہم کر سکتی ہیں ان کی بات اور ہے۔ گو ان کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں سے بھی کم رہی ہے' مگر یہ تادیر زندہ رہتی ہیں۔ باقی سب' یعنی بیشتر' وقت کے گڑھے میں دفن ہو جاتی ہیں۔

کتنی دہشت ناک منزل ہے یہ۔۔۔۔

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا تو پھر یہ کہنا چاہیے کہ شاعری حصول کا نہیں، تلاش کا نام ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو لکھنے والا جلد ہی اکتا جاتا۔ اسکا اضطراب و اضطرار ختم ہو جاتا اور تخلیق کی خواہش بھی۔ جو توانائی لکھنے والے کو تلاش کی طرف گامزن رکھتی ہے' اس کی تقسیم کا حساب بھی اسرار کے پردے میں ہے۔ کون کتنی سانس کھینچ سکتا ہے، کس منزل تک پہنچ سکتا ہے کسی کو نہیں معلوم۔ تلاش بنے بنائے سانچوں میں ڈھلنے، کسی کو دیئے ہوئے راستے پر چلنے کا نام نہیں۔ تلاش کے لئے تو انجانے کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔

اپنے عہد کی بھول بھلیوں میں پھرنا اور اپنے تجربے کی تفسیر بیان کرنا بھی تلاش ہی تو ہے۔ لیکن اپنی سچائی اور اپنی حقیقت کا بیان شعر کے مفہوم یا اس کے موضوع تک محدود نہیں ہے۔ (جن میں ذات کی واردات بھی شامل ہے) واقعات براہِ راست کسی عہد کی حسی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ واقعات سے متاثر ہونے والوں کا فکری ردعمل اس عہد کی حسیت کو مشکل کرتا ہے۔ شاید معاملہ اتنا سیدھا بھی نہیں۔ فکری ردِعمل کیوں اور کیسے تبدیل ہوتا رہتا ہے اسکا تعلق خارجی سطح پر یعنی سماجی' سیاسی اقتصادی سطح وغیرہ پر ہونے والی تبدیلیاں ہیں جو غیر محسوس طور پر ہماری اقدار' ہمارے رہن سہن اور بول چال کے

طریقوں پر اثر انداز ہوکر برے کو اچھا یا اچھے کو برا' غیر اہم کو اہم اور اہم کو غیر اہم بنا دیتی ہے۔ ماحول کی تبدیلی کے ساتھ نئی تشبیہات ، نئے استعارے اور نئی حسی تصویریں شعور اور لاشعور کا حصہ بنتی رہتی ہیں۔ پرانے تصورات بھی کلی طور پر غائب نہیں ہوتے۔ وہ نئے کی دبیز تہہ کے نیچے دبے رہتے ہیں اور کبھی کبھی سر اٹھانے کی کوشش بھی کر لیتے ہیں۔

سو شعر میں واقعات کا بیان نہیں بلکہ انہیں محسوس کرنے کا انداز تخلیق کار کی شناخت ہوتا ہے۔ انفرادیت مفہوم میں نہیں شعر کی فضا میں بولتی ہے۔ شعر کی فضا لفظی تصویروں کے ساتھ ساتھ شاعر کے تخلیقی وجود کی توانائی اور اس کے ذہن (یا اسکی فکری) اور جذبے کے مناسب امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ شاعر' جھوٹ بولتا ہے تو شاید ہو لیکن جھوٹ لکھ نہیں سکتا۔ اگر وہ واقعی شاعر ہے تو یہ اس کے لئے ممکن ہی نہیں۔ جہاں وہ اپنے وجود کی سچائی سے منحرف ہوا' وہیں اس نے ٹھوکر کھائی۔ اس سارے قصے میں فنی قواعد کی بات نہیں آئی اس لئے کہ وہ تو اس پورے عمل کا ایک لازمی حصہ ہیں اور اسی ایک جہت میں شاعر کے خالص منطقی شعوری تشخص کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ فنی تقاضوں پر غور و فکر کرنا ہر شاعر کی ذمہ داری ہے لیکن انفرادیت اس جوڑ توڑ سے بھی پیدا نہیں ہوتی۔ بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جس خوبی کو ہم خداداد کہتے ہیں وہ ذہن کی ماورائی ساخت۔ موزونیت تو صلاحیت ہے' ذہن کے ترفع (transcendence) کی خصوصیت اور خوبی الگ شے ہے۔ اسی کے سبب لکھنے والا عام سطح سے علیحدہ ہوکر' بلند ہوکر سوچنے پر قدرت رکھتا ہے۔ ایک بڑا ماہرِ فن (crafts person) اگر بڑا ذہن نہیں رکھتا تو بڑی شاعری تخلیق نہیں کر سکتا۔ جذبے کی سمت نمائی۔ اگر بڑا ذہن نہ کرے تو وہ شعر کو موثر بنانے کے عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز متناسب مقدار میں ہو تو بات بنتی ہے۔ ظاہر ہے ایسا تناسب تو ہزاروں میں سے کسی ایک ہی کے حصے میں آسکتا ہے۔ مگر دوسرے بھی اپنی تلاش کے عمل کو ترک تو نہیں کر سکتے۔

کلیشے (cliche) سے بچ رہنا بھی بڑی نعمت ہے۔ لفظ' خیال' مضمون' اسلوب' یہ موذی سب کا پیچھا کرتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جب تخلیق اصول و قواعد سے زیادہ واقف نہیں ہوتی اور کھلی فضا میں سانس لے رہی ہوتی ہے تب تو کلیشے کا کہیں اتا پتہ نہیں ہوتا۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے اس کی مداخلت کا خدشہ پیدا ہو سکتا ہے اور اس سے بچنا ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن تخلیق میں فرسودگی اور تازگی ہوتی کیا ہے یہ بھی سمجھنا چاہیے۔

صرف کلیشے کے انکار سے تازگی پیدا نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے اس بات سے اور لوگ متفق نہ ہوں لیکن ایسا لگتا ہے کہ بعض 'جدید' شعرا نے تازگی کے حصول کا بھی ایک فارمولا بنا لیا ہے۔ جس خوبی کو ہم تازگی یا ندرت کہنا چاہتے ہیں وہ فطری احساس سے حاصل نہیں کی جا رہی۔ ایک خاص قسم کی لفظیات، ایک مخصوص نوع کے لفظی پیکر اور تصنع کی ادھوری توانائی سے بنائی ہوئی بات' جو کچھ نئی سی تو ہے لیکن احساس پر گرفت نہیں کرتی اور اپنے آپ کو حد درجہ دہرانے کے عمل میں ہے، جس کے سبب مختلف شاعر بیک ایک ہی طرح کی شاعری کر رہے ہیں۔ فارمولا غزل اور فارمولا نظم' لیکن 'جدید' دراصل بات جب کہنے کو ہو' تب بات کہی جائے تو اسکا ذائقہ ہی اور ہوگا۔

ابہام اور بے جوڑ ٹکڑوں کے اتفاقی ارتباط میں بھی فرق کرنا چاہیے۔ شاعری میں حجاب کا حسن بڑی چیز ہے لیکن اسے اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش میں کامیابی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ بات کے بطن اور اس کی روح میں معنی موجود ہونے چاہیں۔ انہیں باہر سے اس کے قالب میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ بات وجود کی تہہ سے پھوٹی ہو اور کہنے کا سلیقہ بھی ہو تو بعض اوقات پوری کہی ہوئی بات بھی بھلی لگتی ہے۔

بات تو حجاب میں رکھنے کا ہنر فطری مزاج سے بھی متعلق ہے۔ ممکن ہے ایسے ماہر بھی موجود ہوں جو تصنع میں روانی پیدا کرنے پر قادر ہوں اور اس میں زندگی کی روح پھونکنے کا ہنر جانتے ہوں' لیکن تخلیقی عمل کی ایک جہت جسکا لاکھ کوشش کے باوجود بھی معروضی پیمانہ وضع کرنا مشکل ہے' غیب سے 'عطا' ہے' جو رنگ' نسل' عقیدے' عہد' طبقے اور عمر وغیرہ سے ماورا ہے اور جس کی جامع توجیہ مشکل ہے۔ یہ بات نئی نہیں ہے۔ اکثر کہی گئی ہے۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ عطا بھی بغیر مشقت مکمل نہیں ہوتی۔ بہترین خام مال کے بغیر 'عطا' بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ مصنوعی جذبوں کی کھرچن سے شعر بنانے اور گڑھنے کی بجائے بہترین خام مال جمع کرتے رہنا چاہیے اور اسے عطا کے لمحے میں استعمال کرنا چاہیے۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض اوقات 'عطا' کو بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اصل منصب سے روحانی اور ذہنی دوری شاعر کو 'عطا' کی نعمت سے بھی محروم کر سکتی ہے۔

شعر میں تہہ داری کے حوالے سے یہ کہنا پڑے گا کہ قاری کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ بعض تحریریں ایک قرأت

سے زیادہ کا تقاضہ کرتی ہیں جبکہ جلد باز قاری فوری فیصلہ صادر کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ہاں عام قاری شاعر کی تفہیم کی سطح مختلف ہوتی ہے(عام قاری سے مراد پڑھا لکھا باذوق قاری ہے) ایک شاعر کا تجربہ دوسرے سے مماثلت نہ بھی رکھتا ہو پھر بھی وہ حسی سطح پر بہت سی کہی اور ان کہی باتوں کا پتہ لگا لیتا ہے۔ کیا اسکا یہ مطلب ہوا کہ ابہام اور تہہ داری کے معنی سب کے لئے ایک نہیں ہوتے؟ ظاہر ہے' شاعری حجاب کی تہوں میں سب کو ایک معنی فراہم کر بھی نہیں سکتی لیکن کسی ایک سطح پر خواہ وہ ذہنی ہو' حسی ہو' کیفیاتی ہو یا ان سب کا مجموعہ ہو تخلیق کو اپنے قاری کے ساتھ ترسیل اور ابلاغ کا رشتہ ضرور قائم کرنا چاہیے۔

یہ بات اکثر سننے میں آتی ہے کہ اب شعر کا قاری موجود نہیں ہے۔ اس بات کا ایک اور زاویے سے بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے ۔یعنی شعر اب بھی لوگ پڑھتے ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے۔ شاعری جن کا مسئلہ ہے اور اب جن کا Discipline اوڑھنا بچھونا، وہ تو اب بھی شعر پڑھتے ہیں۔ البتہ ادب تفریح فراہم کرنے کے منصب سے ضرور دستبردار ہو رہا ہے۔ جن وقتوں میں ایک خاص سطح کا ادب تفریح کے لئے دستیاب تھا' کیونکہ ابھی تفریح کے دوسرے ذرائع کم تھے' ایک عام قاری کے ذوق کی تربیت بھی اور طرح سے ہوا کرتی تھی۔ اب صورتِ حال مختلف ہے اور اسکے تبدیل ہونے کا امکان بھی نہیں ہے۔ یہ 'مابعد جدید' دور کی دین ہے اور اس کا اختصاص بھی اور صرف ہمارے معاشرے تک محدود نہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ مسئلہ زیادہ سنگین اس لئے ہے کیوں کہ ہماری آبادی جو اب بھی اُردو زبان ہی میں تعلیم حاصل کرتی ہے، معیاری زبان میں تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ وہ اُردو زبان ہی میں معیاری تعلیم ہے۔ جس دن ہم اس ہدف کو حاصل کرنے کا ارادہ کریں گے، اُردو ادب کی تعداد کا مسئلہ اتنا گھمبیر نہیں رہے گا۔ مگر فی الوقت تو صورتِ حال اچھی نہیں ہے۔ تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ کیا ادب کو ترک دینا چاہیے؟ شعر سے منحرف ہو جانا چاہیے؟ آخر دوسرے بھی تو بہت سے علوم ہیں جن میں دلچسپی لینے والوں کا دائرہ محدود ہے۔ وہ تو اپنے آپ میں مگن ہیں' خوش ہیں۔ پھر ادیب اور شاعر کو کیا پریشانی ہے؟ دراصل ہمارے شاعر کو صرف یہ غم نہیں ہے کہ اس کے پڑھنے والے کم ہیں۔ اس کا بڑا دکھ یہ ہے کہ زیادہ رسائی کے سبب جو شہرت ناموری کے امکانات موجود رہتے تھے' وہ مفقود ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں شاعر کو' یعنی سنجیدہ شاعر کو اب فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اسے عامیانہ درجے کی شہرت درکار ہے یا بھرپور تخلیقی اور علمی زندگی۔ شہرتِ عام کوئی بری یا کمتر چیز نہیں اگر خود بخود کسی کے حصے میں آ جائے لیکن اس کے لئے تگ و دو میں اپنا وقت اور اپنی تخلیقی توانائیاں ضائع کرنا کارِ

فضول سے زیادہ کچھ نہیں۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری اپنی تخلیق ہمارے تنقیدی پیمانے پر پوری اترتی ہے؟ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو جسطرح لکھتا ہے یا لکھ سکتا ہے وہ اسی سانچے کو معیار قرار دیتا ہے۔تو کیا تخلیق کار ایسا دانستہ طور پر کرتے ہیں؟ میرے خیال میں ہر لکھنے والا اپنے تخلیقی تجربے کی حدود کا اسیر ہوتا ہے۔اسے اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی تخلیق کا جواز خود فراہم کرے لیکن اس جواز کے لئے بھی کسی سطح کی معیار بندی لازمی ہے۔انفرادی اور ذاتی پسند یا ناپسندیدگی سے قطع نظر، یہ معیار بندی اجتماعی لیکن نامحسوس حیثیت میں موجود رہتی ہے اور کبھی کبھی وقت اسکا اعلان بھی کرتا ہے۔
میں نے اس جملے سے بات شروع کی تھی کہ وقتِ موجود میں جدید اور قدیم کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔
اس حوالے سے کچھ باتوں پر غور کیا جاسکتا ہے:

- جدید کا اگر کوئی معروضی پیمانہ ہو بھی تو کیا پچاس یا سو برس بعد اس کی مصنویت قائم رہے گی؟
- ایسی صورت میں وقتِ موجود کی کن تحریروں کو جدید کہا جاسکتا ہے؟ کیا ایسی تخلیق کو جدید کہنا چاہیے جو اپنے اندر آئندہ وقتوں کے لئے بھی مصنویت رکھتی ہے؟ اس صورت میں کیا جدید کلاسیک کے مترادف ہے؟
- کیا جدید تخلیق ہے جو فنا کی گھاٹیوں میں پڑی وقتِ موجود کی حسی صداقتوں کی ترجمانی کرے اور آنے والے زمانے کے فرد کو اپنے وقت کے حسیت اور اسکے فکری منظرنامے کا نمونہ فراہم کرسکے؟ تو پھر اس صورت میں کیا جدید ہونے کے لئے 'بقا' شرط نہیں ہے۔

یہ اور اسی طرح کے اور سوالوں پر غور تو کیا جاسکتا ہے لیکن جواب فراہم کرنا لکھنے والے کا کام نہیں۔اس کا کام صرف لکھنا ہے اور اسکی کچھ ذمہ داریاں ہیں جن کا اسے خیال کرلینا چاہیے۔کچھ باتیں اس کے اختیار میں ہیں، کچھ اس کے اختیار سے باہر۔ آخری بات یہ کہ شعری سفر میں تربیت کی منزل ہی بہترین جائے قیام ہے اور یہاں قیام اسی صورت میں ممکن ہے اگر لکھنے والے کو اپنی کمزوریوں کا ادراک ہو۔یہی ادراک امکانات کے دشت میں قدم رکھنے کا وسیلہ ہے اور یہی تلاش کو جاری رکھنے کا محرک بھی۔

یاسمین حمید